۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۳۶

اس شمارے میں

۱

اداریہ

اردو دوست
اور
علاقائی زبانیں

ہم یہ بات برابر کہتے رہتے ہیں کہ اردو کی تحریک کسی علاقائی زبان یا ہندی کے خلاف نہیں ہے پھر بھی کچھ علاقائی زبانوں کے علم بردار یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اردو کے فروغ کے معنی علٰحدگی پسندی کی رو کو فروغ دینے کے ہوں گے۔ یہ اعتراض بے بنیاد ہے، مگر اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سہل پسندی عام ہے اور لوگ صرف سیاہ اور سفید کے قایل ہیں۔ کچھ لوگوں کا تو مسلک ہی یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ سو فی صدی ان سے اتفاق نہیں کرتے تو وہ مخالف مان لئے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنے کی بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اردو دوست اگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے ہو اور ان کے لئے اردو میں اعلیٰ تعلیم کی بھی سہولتیں فراہم کی جائیں، نیز حکومت کے کاموں اور عام کاروبار میں اردو کا چلن بھی ہو تو اس کے یہ معنی کسی طرح نہیں لینے چاہئیں کہ وہ ریاستی یا علاقائی زبان کے کسی طرح بھی مخالف ہیں۔ ریاستی یا علاقائی زبان کا جاننا تو کسی ریاست کے رہنے والوں پر بہرحال فرض ہے اور اس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی لسانی اقلیت ریاستی یا سرکاری زبان کے اچھے معیار کی طرف سے غفلت کرتی ہے تو وہ اپنا نقصان کرتی ہے۔ یہ نقصان دو طرح کا ہے۔ ایک تو اسے سرکاری ملازمتوں اور پبلک سہولتوں کے حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے دوسرے اس علاقے کے رہنے والے اس سے وہ یگانگت اور انس پیدا نہیں کر سکتے جو سماجی اور قومی یک جہتی کے لئے ضروری ہے۔ لسانی اقلیتوں خصوصاً اردو اقلیتوں کا کہنا یہ ہے کہ بچے کی شخصیت کی تعمیر اسی وقت صحیح بنیاد پر ہو سکتی ہے جب اسے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اس کی اپنی مادری زبان کے ذریعہ دی جائے۔ اگر اسے تعلیم کسی دوسری زبان میں دی جاتی ہے خواہ یہ دوسری زبان ریاستی یا علاقائی زبان ہی کیوں نہ ہو، تو اس کی شخصیت کی نشوونما صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتی۔ گویا شہریت کے فرائض ادا کرنے کے لئے صحیح بنیاد اپنی زبان ہے۔ یہ بنیاد

مضبوط ہو تو اس پر بالائی تعمیر کسی قسم کی بھی ہو، اچھی ہوگی۔ یعنی اپنی مادری زبان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے والے، علاقائی یا ریاستی زبان میں بھی مناسب مہارت پیدا کر سکیں گے۔ جو شخص اپنی مادری زبان کے بجائے ریاستی یا علاقائی زبان کے ذریعہ سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرے گا، اس کی مادری زبان میں مہارت مشکل ہو جائے گی اور ریاستی یا علاقائی زبان میں وہ شاید کام چلا لے گا، مگر اس کی پوری صلاحیت اجاگر نہ ہو سکے گی۔ اس لئے یہ تو بہر حال اصولی بات ہے کہ لسانی اقلیتوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیے لیکن ان کو ابتدائی تعلیم کے آخری دو سال میں اور ثانوی تعلیم کی ہر منزل پر ریاستی یا سرکاری زبان لازمی طور پر پڑھنا چاہیے تاکہ وہ ریاست کے تمام باشندوں سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ حیدر آباد کے کچھ اردو دوست جو تلیگو سے بھڑکتے ہیں، غلطی پر ہیں۔ ان کو اپنے ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں لازمی طور پر تلیگو بھی پڑھنی چاہیے تاکہ اردو کے طالب علم آئندہ ریاست کے شہری کی حیثیت سے ریاست کی فلاح و بہبود کے تمام کاموں میں حصّہ لے سکیں۔ ابھی چند روز ہوئے ایک اجتماع میں ہمیں بنگلہ دیش کے چند ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کو بنگلہ دیش میں باہر سے آئے ہوئے بہار اور یو۔پی کے مسلمانوں سے شکایت یہ تھی کہ ان لوگوں نے بنگال میں برسوں رہنے کے باوجود نہ بنگالی سیکھی نہ بنگالی ادب سے واقفیت پیدا کی اور نہ بنگالیوں کے جذبات و خیالات سے آشنا ہونے کی کوشش کی بلکہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے رکھی۔ ظاہر ہے کہ ریاست کی زبان، تہذیب اور فضا سے کسی لسانی اقلیت کا علیحدہ رہنا نہ صرف غلط ہے بلکہ خطرناک بھی، اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اردو چونکہ ایک کُل ہند زبان ہے اس لئے ہر علاقے کے اردو بولنے والے جب اردو میں ادب پیدا کریں گے تو اس علاقے کی فضا، اس کی دھرتی کی خوشبو اور اس کی تہذیب کا رنگ اس میں ضرور ہوگا اور اس طرح اردو کا دامن وسیع ہوگا۔ یہ خدمت علاقائی زبان میں اچھی مہارت حاصل کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ ہمیں گجرات کے کچھ ادیبوں کا علم ہے جو گجراتی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں، ایسے لوگ آندھرا پردیش اور مہاراشٹر میں بھی مل جائیں گے۔ ان اشخاص نے اردو کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

اردو کی تعلیم پر اردو دوستوں کا اصرار کسی دوسری زبان سے انکار کے مترادف ہرگز نہیں نہ علاقائی یا ریاستی زبان کا درجہ کم کرنے کے مترادف ہے۔ یہ اپنے راستے سے اور صحیح راستے سے ملکی اور قومی راستے پر پہنچنے کے مترادف ہے۔ اس میں علحدگی پسندی نہیں قومی یک جہتی کا جذبہ ہے۔ ایک منزل کے لئے مختلف راستے ہو سکتے ہیں اور ہر فرد یا گروہ کے لئے وہی راستہ ٹھیک ہے جو اس کے مزاج اور ماحول کے مطابق ہو۔ سب کے لئے ایک منزل ہو سکتی ہے، مگر ایک راستہ ضروری نہیں۔ منزل کے ایک ہونے پر اصرار بجا ہے مگر ایک راستہ پر اصرار غلط ہے۔ کاش یہ نکتہ سب کی سمجھ میں آ جائے۔ اردو دوستوں کو اردو کے علاوہ ریاستی یا علاقائی زبان میں بھی مہارت پیدا کرنا ہے ورنہ وہ قومی دھارے سے کٹ جائیں گے، ریاستی یا علاقائی زبان والوں کو اردو بولنے والوں کو یہ سہولت دینا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے حاصل کریں تاکہ علاقائی زبان یا ریاستی زبان میں بھی مناسب مہارت پیدا کر سکیں۔ قومی یک جہتی کے لئے یہ رواداری اور فراخ دلی ضروری ہے۔ اسی طرح قومی زندگی میں اکثریت اور اقلیت سب کا بھرپور حصّہ ہو سکتا ہے۔

اساتذہ اردو جامعات ہند کانفرنس ملتوی

پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کنوینر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کانفرنس نے ایک پریس نوٹ میں اطلاع دی ہے کہ انجمن کی کانفرنس جو ۳۰ ستمبر اور یکم و دوم اکتوبر ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ یونیورسٹی میں ہونے والی تھی۔ شہر کی سیلابی صورت حال کے پیش نظر ملتوی کر دی گئی ہے۔ اب یہ کانفرنس اسی سال دسمبر ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں ہوگی۔ تاریخوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

• ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

صفحہ ۱۱ سے آگے

اس کا بار بار اعلان کرنا اور اقبال کے یہاں ایک وسیع کینوس پر جہذب اور مستقل شدہ اشعار کے مسلسل اظہار کو جو فنی دروبست سے بھی پوری طرح مزین ہے، جارحانہ انداز بیان سے تعبیر کرنا ایک ایسی کج فہمی اور خود پسندی ہے، جس پر سوائے اظہار تاسف کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

سید مسعود حسن رضوی ادیب

غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ

دربار اودھ سے مرزا غالب کے تعلقات کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ یہ تعلقات اودھ کے آخری فرماں روا سلطان عالم واجد علی شاہ کے آخر عہد تک باقی تھے۔ غالب صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔"

یوسف مرزا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص و رومال و دوشالہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے، یعنی جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔"

جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر سے غالب کی مراد ہیں سلطان العلماء سید محمد صاحب قبلہ۔ سلطان العلماء کے ابن عم زبدۃ العلماء سید علی نقی صاحب کی یادداشتوں کی ایک کتاب لکھنؤ میں حکیم سید علی آشفتہ مرحوم کے پاس تھی جس سے راقم الحروف نے چند تحریریں نقل کرکے رکھ لی تھیں۔ جن کاغذوں پر یہ تحریریں تھیں وہ دوسرے کاغذوں میں مخلوط ہو کر نگاہ سے اوجھل ہوگئے۔ ایک مدت کے بعد پرانے کاغذوں کے الٹ پلٹ کرنے میں ان کاغذوں پر نظر پڑی۔ اس مدت میں یہ کاغذ دو جگہ سے کرم خوردہ ہوگئے جس کی وجہ سے دو تین لفظ پڑھے نہیں جا سکے۔ ان کاغذوں میں سے تین تحریریں اس وقت پیش کی جارہی ہیں یعنی

۱۔ حکم نامۂ سلطان عالم واجد علی شاہ بنام خاندان شاہی
۲۔ سفارش نامۂ سلطان العلماء بخدمت سلطان عالم
۳۔ مکتوب سلطان العلماء بنام مرزا غالب۔

ان تحریروں سے غالب کے ایک قصیدے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کب اور کس موقع پر حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور بادشاہ نے غالب کو کیا صلہ عطا فرمایا۔

کربلائے معلیٰ سے امام حسین علیہ السلام کی خاک شفا کی ضریح واجد علی شاہ کے لئے بھیجی گئی۔ سلطان العلماء مجتہد العصر نے بادشاہ کو اس کی اطلاع دی۔ بادشاہ نے شاہی خاندان کے لوگوں کے نام ایک حکم نامہ جاری کیا جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"دریں وِلا حسب الایما و اجازت مولائے جہاں و جہانیان حضرت ابا عبداللہ الحسین شہید معین مظلومان کربلا ضریح نجف اشرف شدہ وارد این جا حضرت سلطان العلماء مجتہد العصر و الزمان بہ داعی دولت حضرت صاحب الزمان رسیدہ ... بہ سبب عارضۂ خفقان اختیار پیادہ روی نمی دارد۔ لہٰذا قرۃ العین ایں دودمان برخوردار صاحب عالم دعا لمیان مرزا ولی عہد بہادر و دیگر برخوردار جرنیل صاحب بہادر و دیگر شاہزادگان ایں خاندان را حکم دادہ کہ نیابتہ بہ استقبال پردازند و ایشاں ہم شریک استقبال شدہ تا بہ خانہ رسانند۔ عند اللہ ماجور خواہند شد۔ بتاریخ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ یوم شنبہ یک دیم پاس

سید امین اشرف

غزل

صورت رمز و کنایہ سخن آرا کیا ہے
صاف کہتا نہیں غزلوں کا بکھیڑا کیا ہے

جانتا ہوں کہ مرا تجربہ کہتا کیا ہے
وہ مری طرح مگر فکر میں ڈوبا کیا ہے

فاصلے دوری و قربت کے گھٹے جاتے ہیں
درمیان من و تو عشق نے چھوڑا کیا ہے

صفت بوئے رسیدہ ہوں نکل جاؤں گا
سنگ در دیکھ کے اس راہ سے ڈرتا کیا ہے

بکھرے جاتے ہیں سب اعداد و معانی یارب
غور سے دیکھا تو سمجھا ہوں کہ دنیا کیا ہے

وہ یہ کہتا ہے کہ واقف ہوں امین اشرف سے
یہ نہیں جانتا اشعار میں لکھا کیا ہے

روز باقی ماندہ سیاہ پوش شدہ بکربلائے دیانت الدولہ بہادر حاضر شوند۔"

اس ضریح کے ورود کا حال سن کر غالب نے ایک قصیدہ سلطان العلماء کو بھیجا جس کا مطلع یہ ہے ؎

بیا در کربلا تا آں ستم کش کاروان بینی
گروہ دودۂ آدم آل عباد اسیران بینی

سلطان العلماء نے یہ قصیدہ اپنے سفارش نامے کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پیش کردیا۔ سفارش نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

"سلطان عالم خلد اللہ ملکہ! ازاں جا کہ آوازۂ دلنواز بشارت وصول ضریح مبارک خاک شفا از کربلائے معلیٰ برائے بندگان اقدس داعی از بیت السلطنت بیشتر آباد تا دار الخلافت شاہ جہان آباد رسیدہ اسد اللہ خان غالب دہلوی کہ در فن شعر و سخن یکتا و در فصاحت نظم و نثر بے ہمتا و مانند نظیری نظیرے ندارد و اگر کلامش مقبول بارگاہ خاقانی شود ہم پایۂ خاقانی باشد، دریں ولا قصیدۂ غرا در مدیح ضریح بطرز بلیغ و بیان فصیح انشا نمودہ و بجادۂ مدحت گری و ثنا گستری بندگان سکندر شان را بہ قدم اقدام پیمودہ بہ مفاد

تملقہا جو ملت بر جبل ہوں تجزادیہ
تو سلیمانی کن اے عالی نژاد

بطریق۔۔۔ کہ بعد قبول تحفۂ موفرہ می گردد بحضور معلیٰ گزرانیدہ لہٰذا داعی کہ در امور خیر ساعی می باشد بہ بارگاہ فلک جاہ آں را ارسال داشتہ۔ اگر قبول نشد زہے عز و شرف۔ و چوں متضمن مرثیہ و اشعار مبکیہ است، غالب کہ بہ مودائے فقرۂ شریفہ کہ در حدیث ثواب بکا و تباکی وارد گشتہ، غفر اللہ ذنوبہ و دوکانت مثل باعث عفو و غفران لغزش قدم و لرزش قلم کہ در مثنوی سابق لاحق حالش شدہ بود گردد۔ رجائے واثق کہ ہمواره مادح ممدوح مورد مراحم سلطانیہ و عنایات خاقانیہ از پیش گاہ بارگاہ جم جاہ بودہ باشد۔ دائما خورشید معدلت گستری از مطلع عنایات خسروی طالع و لامع باد۔"

سلطان العلماء کی سفارش پر بادشاہ نے غالب کو خلعت فاخرہ عطا کیا، لیکن سلطان العلماء کو خیال ہوا کہ دہلی کے بادشاہ اور شاہی خاندان سے غالب کے تعلقات ہیں، کہیں اس عطیے کا بھیجنا بادشاہ دہلی کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور یہ بات غالب کے مقررہ وظیفے کی برہمی کا باعث نہ بن جائے۔ اس خیال سے انھوں نے اس معاملے میں توقف کیا اور غالب کو لکھا کہ اب آپ جو مشورہ دیں اس پر عمل کیا جائے۔ اس مضمون کا خط جو سلطان العلماء نے غالب کے نام بھیجا تھا وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"مشفق خاطر تو دد آثر باد کہ پیشتر در پاسخ صحیفۂ انیقہ مکتوب مشعر بر ایصال معروضہ مع قصیدۂ فریدہ بہ پیش گاہ سلطانی نوشتہ ارسال داشتہ ام، مقصود ایں است کہ بر نظر شریف رسیدہ باشد و دیگر پاسخش ہنوز نہ رسیدہ۔ بالفعل امر تازہ کہ قابل اظہار است ایں کہ قصیدہ موصوفہ کہ متضمن مدح مرقد آبدار والائی متلالی شاہوار بود خیلے پسند خاطر مبارک بندگان دادار دربان افتاد۔ تشریف قبول بہ نہج معمول۔۔۔۔۔ بہ اعطائے ارسال خلعت فاخرہ از بارگاہ سپہر اشتباہ صادر شد۔ اما بخیال ایں کہ آں ناظرۂ بوستان سخن دانی با ہمہ دو دمان صاحب قرانی در بیت اورنگ گورگانی تعلق و توسلے دارند مبادا ابلاغ ایں عطیہ شریفہ مخالف مزاج آں بادشاہ جم جاہ و باعث برہمی وظیفۂ مقررۂ سامی شود لہٰذا دریں باب توقف نمودہ شد۔ الحال آنچہ مشورۂ سامی گرامی باشد بہ عمل آید یوم الاحد الرابع من شہر ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ۔"

اس خط کے لفافے پر حسب ذیل عبارت تھی:۔

"بعوضہ و صونہ تعالیٰ در شاہ جہان آباد صینت عن الفساد بہ انامل سعادت شمائل خان صاحب والا مناقب عالی مناصب فارس میادین سخن وری ماحی کارنامۂ خاقانی و انوری نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ زاد مدار جہ و علا معارجہ مفتوح باد۔"

ملہ دیکھیے نگارشات ادیب میں راقم کا مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی۔"

محمد عدیل عباسی

اردو کی قانونی حیثیت

(جناب عدیل عباسی صاحب کا ایک طویل بیان اخبار قومی آواز میں شائع ہوا ہے اس کے آخری حصے کے کچھ اقتباسات قارئین کی معلومات کیلئے ہماری زبان میں پیش کئے جاتے ہیں (ادارہ)

میں ان باتوں کو گنا تا ہوں جو ہمیں کرنی ہیں۔

(۱) سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے یا جو حقوق ہم کو ملے ہیں ان کا آرٹیکل ۳۴۷ میں اعلان ہو جائے۔ یہ حقوق ہماری جیں لاکھ دستخطوں کی مہم کے نتیجہ کے طور پر اس طرح ملے ہیں کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے سمپورنانند جی وزیر اعلیٰ کو راضی کر کے دلائے تھے مگر ان کی قانونی حیثیت نہیں ہے اور اگر عمل درآمد نہ ہو تو ہم عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے اس کے لئے ہمیں بھرپور جدوجہد کرنی چاہئے اور کوئی وجہ نہیں کہ یو۔پی گورنمنٹ جو ان پر رضامندی دے کر ان کا اعلان کر چکی ہے ان کے قانونی حیثیت دیئے جانے پر معترض ہو آخر حقوق اسی کے قلم سے ملے ہیں۔

(۲) ان حقوق میں عدالتوں میں اردو میں درخواستیں دینے کی اجازت بھی شامل ہے اور اس لئے کرنل زیدی سابق صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کی بار بار کوشش کئے جانے پر حکومت یو۔پی کے آرڈر سے ہائیکورٹ سول فوجداری دیوانی مینوئل مترجم ہوئے ہیں لیکن جب اردو میں درخواستیں دی جاتی ہیں یا اردو میں لکھی ہوئی کوئی دستاویز پیش ہوتی ہے تو عدالتیں کہتی ہیں کہ ہم کو اردو سے واقفیت نہیں ہے اور وکیل سے فرماتی ہیں کہ آپ اردو کی خدمت کرنے آئے ہیں یا اپنے موکل کی۔ اس لئے اگر واقعی یہ حق دینا ہے تو یو۔پی گورنمنٹ کو یہ قانون بنانا چاہئے کہ کوئی افسر اس وقت تک مستقل نہ ہوگا جب تک اردو کا ابتدائی علم نہ رکھتا ہو۔ ایک مرتبہ جب یہ مطالبہ مسز سچیتا کرپلانی کے سامنے پیش ہوا جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھیں تو انھوں نے کہا کہ میں ہر دفتر میں ایک اردو پڑھنے والا مقرر کردوں گی ہم اور جناب اشرف انصاری فوراً بولے منظور مگر ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں اگر گورنمنٹ اپنے دعوے میں سچی ہے تو یہ مطالبہ اسے منظور کرنا چاہئے۔

(۳) اردو کو ثانوی سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کا حکم ہو چکا ہے لیکن نہ ابھی تک کتابیں تیار ہوئی ہیں اور نہ اردو پڑھانے والوں کی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ ہمیں جدوجہد کرنی چاہئے کہ اردو کی کتابیں تیار ہوں اور اردو پڑھنے کے لئے ٹریننگ اسکولوں میں انتظامات کئے جائیں۔ یہ تو ہوا گورنمنٹ کے کرنے کا کام اپنے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم کثرت سے جونیر ہائی اسکول کھولیں اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا زوردار مطالبہ کریں۔

(۴) ہم کو یہ بھی مطالبہ کرنا چاہئے کہ سرکاری دفتر انسٹی ٹیوشن اور عدالت کے کمروں پر جو تختی لگائی جائے اس پر اردو میں لکھا جائے اور سڑکوں پر جو میل کے نشانات گڑے ہیں ان پر اردو میں بھی لکھا جائے۔

(۵) دفتروں میں اردو میں درخواستیں دینے کی جو اجازت ہوئی ہے اس پر عمل درآمد ہو اور سب سے پہلے وزراء اور سکریٹریٹ کے دفتروں میں اس پر عمل ہو اور اردو کی درخواستیں لی جائیں اور ان کا جواب اردو میں دیا جائے۔

(۶) جو سٹ بہیاں جو اردو میں تقسیم ہوتی ہیں ان پر صرف اوپر کا عنوان اردو میں ہوتا ہے اور اندر کل مضمون ہندی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ ان کو اردو میں لکھا جائے۔

(۷) بقیہ باتیں بہت ہیں لیکن وہ ضمنی اور بطور تقاضوں کے ہیں۔

کیا ہمارے محبان اردو ان باتوں پر غور کریں گے؟

مترجم برہم ناتھ دت

رگوید — ۱۱۱۷ — ۹
اندرا دیوتا

میں خورشید زادہ ہوں، خورشید جیسا ہوں۔
میں نے اپنے باپ[۱] دھرم شاستر کا پورا پورا گیان[۲] حاصل کر لیا ہے۔
اگلے وقتوں کے شاعروں کی تقلید میں، کانو کی طرح میں،
بھی پُر اثر شعر کہتا ہوں۔
جن سے اندرا کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔
اے اندرا! کس رشی نے تیری توصیف نہیں کی کس نے
تیرے گن نہیں گائے۔
میری مدحت سرائی بھی تیری بڑائی کا باعث بنے!
اے اندرا! یہ چتکبری گوئیں تجھے ماکھن اور دودھ دیتی ہیں۔
اور اس طرح یگیہ[۳] میں تیری مددگار ثابت ہوتی ہیں۔
سورج کی شکل اجس[۴] سے ہر تنے نشوونما پاتی ہے۔
یہ بھی مینہ کے ذریعہ تجھ سے تخم حیات حاصل کرتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔
اے اندرا! یہ قصیدہ میری طرف سے قبول فرما اور صدق دل سے میری حفاظت کر۔
میرے خیالات کو بلندی دے اور میرے جذبات کو تقویت
اے عالی مرتبت کرشمے اور گرجنے والے دیوتا! ہم شاعروں نے بڑی عقیدت سے یہ مناجات لکھی ہے، تاکہ ہمیں درازی عمر نصیب ہو۔
اپنے تیز رفتار کمیت گھوڑوں پر آجا، دور دراز خطوں سے ہمارے پاس آجا۔
اور اے اندرا! سوم رس[۵] نوش فرما۔

---

۱ متبرک کتابیں ۲ علم معرفت ۳ قربانی ۴ پانی کلس وغیرہ ۵ پاک شراب

مراسلات

مشمولات نقوش غالب نمبر ۳

ہماری زبان کے پچھلے کسی شمارے میں نقوش غالب نمبر ۳ کی اشاعت سے متعلق خبر شائع ہوئی تھی لیکن اس سے اس کے مضامین سے آگاہی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس نمبر کے مشمولات کی مکمل فہرست پیش ہے۔

(۱)

اس عہد کے شاعروں کا غالب کے بارے میں اظہار رائے

جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، ادا جعفری

(۲)

انکشافات

غالب اور نواب حسام الدین حیدر نامی، ڈاکٹر اکبر حیدری۔ غالب اور تذکرہ بحر ذخار، نثار احمد فاروقی۔ نواب الٰہی بخش معروف کا غیر مطبوعہ کلام، محمد ایوب قادری۔ میرزا غالب اور فن تاریخ گوئی، ڈاکٹر اکبر حیدری۔ قادر نامہ، عبدالقوی دسنوی۔ مرزا محمد عظیم بیگ شاگرد غالب اور سودا، ڈاکٹر ذاکر الدین صدیقی۔ غالب کے نو دریافت خطوط، آفاق احمد۔ رفعت شروانی شاگرد غالب کی خود نوشت تحریریں، نادم سیتاپوری۔ شاداں بلگرامی کی غیر مطبوعہ شرح غالب، سید احمد رضا بلگرامی۔ کلیات غالب پر غالب کی تحریر، عطیہ خدا بخش لائبریری۔ دیوان غالب کے حاشیے پر غالب کی تحریر، عطیہ خدا بخش لائبریری۔ صوفی منیری کے کلام پر غالب کی تحریر، عطیہ اطہر شیر۔ ایک لفافہ پر غالب کی تحریر، عطیہ اطہر شیر

(۳)

عہد

غالب کا عہد، انور سدید۔ غالب تہذیبی نظم پر، سلطان احمد۔

(۴)

فن و شخصیت

غالب کی شخصیت، رشید احمد صدیقی۔ غالب کی شاعری، رشید احمد صدیقی۔ غالب کی شخصیت اور فن، ڈاکٹر وارث کرمانی۔ اشاریۂ غالب، غلام رسول مہر۔ غالب ایک انفرادیت پسند شاعر، ممتاز حسین۔ مطالعۂ غالب کے نئے امکانات، نثار احمد فاروقی۔ غالب کا فنی ارتقا، ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ غالب کا نارسیدہ کلام، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ معرکۂ کلکتہ اور آشتی نامہ، مسلم ضیائی۔ دیوان غالب کی شاعری کا ہندی ترجمہ، علی سردار جعفری۔ غالب کے تنقیدی نظریات، ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ عظمت غالب کی حقیقی بنیاد، عبدالمغنی۔ مشکل پسند غالب، سید تقی حسن عابدی۔ غالب اور چراغاں، ڈاکٹر مسیح الزماں۔ غالب، غمگین اور غالب، یوسف جمال انصاری۔ غالب کی دقت پسندی اور فارسیت، افتخار احمد فخر۔ غالب اور اقبال، جگن ناتھ آزاد۔ غالب سے متعلق کچھ تاریخی قطعے، عبدالرؤف عروج۔

(۵)

بیاضِ غالب

چند حقائق، بلا تبصرہ، ادارہ۔ بیاض غالب کی اصلاحیں، ڈاکٹر گیان چند۔ بیاض غالب (نسخۂ بھوپال ثانی)، عبدالقوی دسنوی۔ غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ بیاض غالب کا تجزیاتی مطالعہ، سلیم اختر۔ کیا نو دریافت بیاض کا کاتب غالب ہے؟ مرتبہ گیان چند۔

(۶)

تقریبات بہ سلسلہ بیاض غالب

پہلی تقریب۔

خطبۂ صدارت، نواب زادہ شیر علی خاں۔ غالب کی تلاش، سید وقار عظیم۔ تقریب افتتاح غالب نمبر، کرنل محمد خاں۔ نقوش طفیل، سید ضمیر جعفری۔

دوسری تقریب۔

خطبۂ صدارت جوش، انوار الحق۔ ابتدائی کلیات، قیوم نظر۔ بیاض غالب کی دریافت، مولانا غلام رسول مہر۔ غالب نمبر حصہ دوم کے بارے میں، ڈاکٹر وحید قریشی۔

تبصرے

غالب، حیات اور خطوط، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ گل رعنا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ غالب شاعر امروز و فردا، سید وقار عظیم

• عبدالقوی دسنوی

"اردو میں لسانیاتی تحقیق۔ تعارف و تبصرہ

زبان قدرت کی ایک ایسی دین ہے کہ جس کی قیمت متعین کرنا آسان نہیں، جب سے انسان اس دنیا میں آیا کسی نہ کسی صورت وہ اس سے کام لیتا رہا اور اس کا دائرہ اثر بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا ایک مستقل وسیلہ بن گئی، اس کی اسی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ اس کی اصلیت معلوم کرنے اور اس کی افادیت کو بڑھانے کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف سمتوں سے کوششیں ہوتی رہیں اور زبان اور اس کے مسائل بعض علماء و فلاسفہ کا ایک مستقل موضوع بن گئے۔

یونان کو علوم و فنون کا اولین سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، یہ بحث بھی یونان ہی میں سب سے پہلے شروع ہوئی تھی کہ زبان کی اصلیت کیا ہے اور کس طرح اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے انھوں نے ہی اس بات پر سب سے پہلے غور کرنا شروع کیا تھا کہ

زبان کائنات کی اور چیزوں کی طرح ایک قدرتی چیز ہے جس میں ہم آہنگی اور تسلسل بطور خود پایا جاتا ہے یا یہ کہ وہ انسان کے اس کے اپنے بنائے ہوئے چند بے معنی نشانات پر مشتمل ایک مصنوعی نظام رابطہ ہے جس سے وہ اپنی بات دوسرے انسان تک پہنچاتا ہے؟

علاوہ ازیں انھوں نے اپنی زبان "یونانی" کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کے لئے کچھ اصول و ضوابط بھی مرتب کئے اور انھیں کو ہر زبان کے پرکھنے کا ایک پیمانہ بھی قرار دیا۔ یونانی علما کا بنایا ہوا لسانی قواعد کا یہ ڈھانچہ بعد میں ترقی پانے والی مغربی زبانوں کے لئے ایک مثال بن گیا اور دنیا کی دیگر زبانوں کے قواعد بھی اسی نہج پر ترتیب دئے جانے لگے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جب نئی زمین نئے آفاق دریافت ہونے لگے اور مغربی اقوام کو نئے نئے لوگ نئی زبانوں سے واسطہ پڑنے لگا تو انھیں احساس ہوا کہ روایتی قواعد ان نئی زبانوں کے سمجھنے اور سیکھنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر رہی ہے اس کے لئے انھیں کوئی اور راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ چنانچہ انھوں نے زبان کو قدرت کی دین سمجھ کر لفظ و معنی کے روایتی رشتوں کو سلجھانے کی بجائے اس کو انسان کا اپنا بنایا ہوا ایک مصنوعی نظام رابطہ قرار دے کر محض اس کی ظاہری ساخت، اس کی آوازیں اس کے اجزا اور اس کے طریق کار کی بنیاد پر اس کو سمجھنے اور سیکھنے سکھانے کا ایک نیا راستہ تلاش کیا اور جدید لسانیات کے نام سے ایک نئے علم کی بنیاد رکھ دی۔ یہ علم آج یورپ اور امریکہ میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں ایک مدت تک زبان اور علم زبان پر سوچنے اور کام کرنے کا انداز وہی پرانا رہا۔ اسی لئے لسانیات کا لفظ جب بھی سننے میں آیا لوگ اس کو زبانوں کی تاریخ یا روایتی قواعد کا علم سمجھتے رہے لیکن اب آہستہ آہستہ یہاں بھی جدید لسانیات کا چرچا عام ہو رہا ہے اور اس کی تعلیم کے لئے یہاں کی مختلف چھوٹی بڑی یونیورسٹیوں میں مستقل شعبے قائم کئے جا رہے ہیں اور طلبہ میں بھی اس جدید علم کی اہمیت کا احساس جاگ اٹھا ہے۔

اردو زبان کو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدل لینے کا انداز خوب آتا ہے۔ چنانچہ جب تک روایتی قواعد کا چلن رہا اردو میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے کافی کام ہوا جس کی آخری کڑی ڈاکٹر عبدالحق کی قواعد اردو تھی اور جب جدید لسانیات کا ہر طرف بول بالا ہوا تو اس کی طرف بھی اردو زبان کے متعدد عالم بڑھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نام سرفہرست ہے۔ اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ آج بھی اس کی مشعل ہاتھ میں لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی ان چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے ایک ہیں جنھیں بمبئی یونی ورسٹی سے قدیم و جدید دونوں ہی لسانیات میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان کا پہلا مقالہ جس پر انھیں بمبئی یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۶۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی محمد حسین آزاد پر تھا جن کی آبحیات اور سخندان فارس ادب سے زیادہ قدیم لسانیاتی تحقیق کی آئینہ دار ہیں اور ان کا دوسرا مقالہ جن پر انھیں بمبئی یونی ورسٹی ہی کی طرف سے سنہ ۱۹۷۰ء میں دوسری ڈاکٹریٹ ملی بمبئی کی اردو پر جدید لسانیات سے متعلق تھا اور جدید لسانیات میں بمبئی یونی ورسٹی کی طرف سے منظور ہونے والا پہلا مقالہ تھا۔ اس طرح وہ زبان اور علم زبان کے قدیم و جدید دونوں مکاتیب اور ان کے طرز فکر و طریق کار سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ مستقل طور سے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے اور ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتاب "اردو میں لسانیاتی تحقیق" بھی ان کے اسی علم اور دلچسپی کا ایک حسین عکس ہے۔

اس کتاب میں حرف و صوت، زبان اور بولی، لفظ و معنی، افکار و مسائل، صوت و شعر اور رسم خط کے چھ ذیلی عنوانات کے تحت بیس سے زیادہ اردو زبان کے قدیم و جدید ماہرین کے منتخب رشحات قلم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ہر حصہ کی ابتدا میں ابتدائیہ کے عنوان سے خود مرتب کا ایک وضاحتی نوٹ ہے۔ جو نہ صرف پس منظر کا کام کرتا ہے بلکہ متعلقہ مضامین کی لسانی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

کتاب کا پیش لفظ اردو کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے اس میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ زبان، علم زبان اور جدید لسانیات کے نشو و نما کی پوری تاریخ مختصراً بیان کر دی ہے۔ پھر خود مرتب کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اردو میں لسانیاتی تحقیق کی رفتار پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب سے ان کا مقصد کیا ہے۔

انگریزی میں اس قسم کے اہم لسانی مقالات کو ایک موضوع کے تحت یکجا کر کے شائع کرنے کا رواج عام ہے۔ اردو نے اس رواج کو ابھی اپنایا نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس طرف پیش قدمی کرنے میں پہل کی اور قدیم و جدید لسانیاتی مقالات کا یہ نمائندہ انتخاب ہمیں عنایت فرمایا۔ جو اساتذہ، طلبہ یا اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین، لسانیاتی تحقیق میں قدیم و جدید کی موجودہ کشمکش کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہایت مفید اور کارآمد ہے اور اس لائق ہے کہ ہر اس یونیورسٹی میں جہاں لسانیات کا مستقل شعبہ موجود ہے، داخل نصاب ہو۔ ضخامت ۳۴۶ صفحات، قیمت ۱۲/۵۰ روپے ملنے کا پتہ اکولا اینڈ کمپنی اورینٹل بک سیلرز اینڈ پبلشرز بمبئی ۳-
بمبئی۔

• حامد اللہ ندوی

اخبار و اذکار

اردو فکشن پر شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کا سہ روزہ سیمینار

۲۷ راگست سے ۲۹ راگست ۸۲ء تک شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے اردو فکشن پر ایک سہ روزہ سیمینار ہوا۔ اس سیمینار میں اردو کے افسانوی ادب کے علاوہ مغرب میں فکشن کی روایت، ناول اور افسانے کے فن اور دوسرے متعلقہ مسائل اور موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور ان پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ شعبۂ اردو نے اس سے پہلے بھی شعر و ادب کے مختلف رجحانات اور اصناف پر کئی اہم سیمینار کئے ہیں۔ افسانوی ادب پر برصغیر ہند و پاک میں یہ اپنی قسم کا پہلا سیمینار تھا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور دانشوروں کے علاوہ ملک کے ممتاز افسانہ نگاروں نے شرکت کی اور سنجیدہ علمی سطح پر افسانوی ادب کے مختلف النوع پہلو زیر بحث آئے۔

سیمینار کا پہلا جلسہ ۲۷ راگست کو دن کے تین بجے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ہوا۔ صدر شعبہ، پروفیسر آل احمد سرور نے مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سیمینار بھی شعبے کی صحت مند علمی و ادبی روایات کا ایک حصہ ہے۔ کسی نہ کسی اہم موضوع پر شعبے کی جانب سے ہر سال سیمینار ہوتے رہے ہیں۔ فکشن کا سرمایہ مقدار و معیار کے اعتبار سے ہمارے ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سیمینار کا مقصد اسی گرانقدر سرمائے کا جائزہ لینا اور اس کے تخلیقی سفر کی منزلوں اور رستوں کا تجزیہ کرنا ہے۔ مختلف زاویۂ نظر رکھنے والے معلوں نقادوں اور ادیبوں کی موجودگی سے یہ توقع ہوتی ہے کہ فکشن کے مسائل پر نئی باتیں سامنے آئیں گی اور نئے انداز سے سوچنے میں مدد ملے گی۔

سرور صاحب کی تقریر کے بعد یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جناب محمد فضل الرحمٰن نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو فکشن کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اس صنفِ ادب کی مقبولیت اور رفتارِ ترقی ہر لحاظ سے حوصلہ افزا رہی ہے۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق تفریحی مشغلہ نہیں بلکہ ایک سنجیدہ عمل ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ادیب معاشی طور پر فارغ البال ہوں اور ہمہ وقتی طور پر خود کو اس کیلئے وقف کر سکیں۔

فضل الرحمٰن صاحب کی تقریر کے بعد سرور صاحب کے مقالے "فکشن کیا؟ کیوں؟ اور کیسے" سے سیمینار کا آغاز ہوا۔ اس مقالے میں فکشن کی اہمیت، اس کے فکری اور جمالیاتی عمل اور ہیئت سے متعلق چند بنیادی سوالات سے بحث کی گئی تھی۔ موضوع کے مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرور صاحب نے فرمایا کہ عام انسانی رشتے ہر ادبی موضوع کی اساس ہیں لیکن ادب میں ان کی قدر و قیمت کا تعین ان کی فنی ہیئت اور حیثیت کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ فکشن میں بھی بنیادی اہمیت فن کی ہوتی ہے جس کی تخلیق و تعبیر کا عمل، اپنے تمام ذہنی اور جذباتی رشتوں کے باوجود، ایک آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہی آزادی فن کو مکاتب فکر اور نظریات کی حد بندیوں سے نکال کر وسیع اور ہمہ گیر حقیقتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

سرور صاحب کے بعد پروفیسر کلیم الدین احمد کا مقالہ "ناول کا فن" جناب عتیق احمد صدیقی نے پڑھا۔ کلیم الدین صاحب علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکے تھے۔ اس مقالے میں ناول کے قصے اور کرداروں کا تجزیہ ناول کی ہیئت اور اس کے لفظی نظام کے تناظر میں کیا گیا تھا اور قصے کی تعمیر میں الفاظ کی ترتیب اور ان کے فکری اور جمالیاتی عمل کی نشاندہی کی گئی تھی۔

تیسرا مقالہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے پڑھا۔ عنوان تھا۔ "آج کا مغربی ناول — تصورات اور نظریات"۔ اس مقالے میں جدید مغربی ناول کے ارتقا اور بدلتی ہوئی تخلیقی قدروں کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اس تصور کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ ناول اور افسانہ زمان و مکان میں مقید ہے اور شاعری اس جبر سے آزاد ہے چنانچہ صنفی اعتبار سے

شاعری کو تمام اصنافِ ادب پر فوقیت حاصل ہے، اسی لئے افسانوی ادب کا ارتقا مغرب کی تمام زبانوں میں شاعری اور ڈرامے کے زوال کے بعد ہوا۔ افسانہ اور ناول کے جدید تر تخلیقی تصورات کے حوالے سے فاروقی صاحب نے یہ بھی کہا کہ جدید مغربی فکشن جن تجربوں سے گزر رہا ہے انھیں زمان و مکاں کی قید سے نکلنے کی کوشش سمجھنا چاہئے۔ اس کے بعد ناول کے فن پر ایک اور مقالہ ڈاکٹر مظفر عباس نقوی نے پڑھا۔ اس مقالے میں زبان اور بیان کے چند پہلوؤں کے پیش نظر ناول کے تعمیری عناصر کا جائزہ لیا گیا تھا اور جزئیات نگاری واقعاتی تسلسل، حرکت و رفتار اور وحدتِ تاثر کی روشنی میں ناول کے فن سے بحث کی گئی تھی۔

جناب جوگندر پال کے مقالہ "افسانے کا فن" اس جلسے کا آخری مقالہ تھا۔ اس مقالے میں افسانے کی تخلیق کے مراحل اور فن کار کی ذاتی زندگی سے اجتماعی زندگی کے روابط کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی کے یہ دونوں رُخ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ وہ زندگی جو ایک اکیلی ذات میں گم ہو فن کی تخلیق نہیں کر سکتی اور فن کار کو ذاتی اور اجتماعی زندگی کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۸ر اگست کی صبح ۱۰ بجے سیمینار کے دوسرے جلسے کا آغاز پروفیسر احتشام حسین کی صدارت میں ہوا۔ پہلا مقالہ احتشام صاحب نے "نذیر احمد کے ناول" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے نذیر احمد کے ناولوں کی فکری اور تہذیبی بنیادوں پر ان کی اہمیت اور امتیازات کی وضاحت کی تھی۔ احتشام صاحب کا خیال تھا کہ کوئی بھی حال اپنے ماضی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اس کی معنویت وقت کے تسلسل کی روشنی ہی میں نمایاں ہوتی ہے۔ نذیر احمد کے ناول اسی فکری اور تہذیبی کشمکش کی دستاویز ہیں جن سے ان کا عہد دوچار تھا چنانچہ ان کا مطالعہ محض اولین ناول نگار کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک اہم تہذیبی منظر کا مطالعہ بھی ہے۔

جلسے کا دوسرا مقالہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے "گئودان کی زبان کے بعض مسائل" کے عنوان سے پڑھا۔ گئودان کے اردو اڈیشن کی زبان، لہجہ، اسلوب اور صوتی و لسانی حیثیت کے مجموعی تاثر نیز چند ناگزیر خارجی اور داخلی شواہد اور تاریخی حقائق کی بنیاد پر مسعود صاحب نے اس واقعے کی نشاندہی کی کہ گئودان کا اردو پریم چند کے اصل ہندی ناول کا اردو ترجمہ ہے اور اسی حیثیت سے اسے دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔ مسعود صاحب کے بعد ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے اپنے مقالے "آگ کا دریا سے لہو کا پھول تک" میں آزادی کے بعد اردو کے چند اہم ناولوں کا جائزہ پیش کیا۔ اس مقالے میں کئی اہم ناولوں کی ہیئت اور ان کے موضوع کے مسائل سے بحث کی گئی تھی۔ اس کے بعد جناب بشیر بدر نے "امراؤ جان ادا اور جدید ذہن" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ انھوں نے قدیم اور موجودہ دور میں عورت کی سماجی حیثیت اور محبت کے بدلتے ہوئے تصور کی روشنی میں امراؤ جان کے کردار کا تجزیہ کیا تھا۔

تیسرے جلسے کی ابتدا ۲۸ر اگست کو دن کے تین بجے پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوئی۔ جناب رام لعل کا "افسانے کا فن" اس جلسے کا پہلا مقالہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ افسانے کی زبان کو زیادہ سے زیادہ فطری اور زندگی کے عام آہنگ سے قریب ہونا چاہئے تاکہ تجربے کا تاثر لسانی تصنعات کی نذر نہ ہو سکے۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، اس کی اہمیت کا انحصار فن کار کے تجربے کی صداقت اور اثر پذیری پر ہے اور تجربات کی مماثلت ہی قاری اور فن کار کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد جناب اختر انصاری، دہلوی کا مقالہ "مختصر افسانہ ۱۹۳۶ء تک" جناب اطہر پرویز نے پڑھ کر سنایا۔ اختر صاحب علی گڑھ سے باہر تھے چنانچہ خود شریک نہ ہو سکے۔ اس مقالے میں بہت تفصیل کے ساتھ افسانے کے ابتدائی دور، رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف افسانے کے سفر اور اس پر اثر ڈالنے والے سیاسی اور تہذیبی حالات و حوادث کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اختر انصاری صاحب کے مقالے کے بعد جناب سلامت اللہ خاں نے اپنے مقالے "اردو افسانہ ۱۹۳۶ء سے آج تک" میں ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا سے علامتی اور تجریدی افسانے کی منزل تک افسانے کے سفر کی نوعیتوں سے بحث کی۔ پھر انور عظیم صاحب نے "افسانہ اور رد افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد" کے عنوان سے اپنا طویل مقالہ پڑھا۔ فن کے سیاسی اور تہذیبی روابط کی وضاحت کے ساتھ ساتھ انھوں نے بیدی اور منٹو کے حوالے سے اعلیٰ تخلیقی اظہار کی ہیئت کا جائزہ لیا اور موجودہ دور کے چند ممتاز افسانہ نگاروں کو انھیں کی روایت کے تسلسل کا نشان قرار دیا۔ انھوں نے صحافت اور ادب کے امتیازات، ترقی پسند تحریک کی ادعائیت کے نتائج اور نئی فیشن پرستی کے میلانات سے بھی بحث کی۔ جلسے کا آخری مقالہ جناب اقبال مجید نے "مختصر افسانہ آزادی کے بعد" کے عنوان سے پڑھا جس میں ۱۹۴۷ء کے بعد رونما ہونے والے اہم تخلیقی رویوں اور ان کے مثبت و منفی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا تھا۔

اسی روز رات کے آٹھ بجے شب افسانہ کی محفل میں سریندر پرکاش، سمیع اللہ، جوگندر پال، شرون کمار ورما اور رام لعل نے اپنے افسانے سنائے۔

۲۹ر اگست کی صبح کو سیمینار کا چوتھا جلسہ جناب محمد فضل الرحمٰن کی صدارت میں ہوا۔ پہلا مقالہ جناب شرون کمار ورما نے "افسانوی ادب پر فرائڈ کے اثرات" کے عنوان سے پڑھا۔ انگارے کے افسانہ نگاروں سے لے کر منٹو، بیدی، عصمت اور ممتاز مفتی تک، انھوں نے افسانے پر فرائڈ کے اثرات کا جائزہ لیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ فرائڈ کے نظریات اوّلاً ایک باغیانہ روش کے طور پر قبول کئے گئے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے افسانے کو ایک نئی حقیقت پسندی اور ذہنی و جذباتی معنویت سے روشناس کرایا۔

اس جلسے کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر وحید اختر نے "آگ کا دریا پر وجودیت کے اثرات" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے جدید تخلیقی مزاج اور

وجودی فکر کے مماثل پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے بعد قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کے بنیادی افکار و مسائل اور وجودیت کے مختلف مکاتب فکر سے ان کی ہم آہنگی کا تجزیہ کیا۔ اقدار کے بدلتے ہوئے تصور، عقل اور غیر عقل، تنہائی، موت، وقت، اختیار اور غیر اختیار، ان تمام مباحث کی روشنی میں انھوں نے قرۃ العین کے کرداروں اور ان کے فکری اور جذباتی رویوں کا جائزہ لیا تھا۔

اس کے بعد جناب دیویندر اسر نے اپنا مقالہ "حقیقت: افسانے کی تلاش میں" پڑھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ذات کی تلاش ادھوری حقیقت ہے اور خالص ادبی معیار کا تصور بے معنی ہے چنانچہ وسیع تر تہذیبی، ذہنی، سیاسی اور جذباتی تناظر میں ہی اس تلاش اور معیار کو سمجھا جا سکتا ہے اور انسان دوستی کے ایک واضح اور ہمہ گیر تصور کے بغیر فنی تخلیق ممکن نہیں۔

جلسے کا آخری مقالہ جناب بلراج مینرا نے "تبولا" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے موجودہ تہذیبی اور سیاسی فضا میں ادیب کی ذمہ داری اور اس کے سماجی رشتوں سے بحث کی اور ان رجحانات کو مہلک قرار دیا جو زندہ حقیقتوں سے بے نیاز ہو کر لفظی شعبدہ بازی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔

سیمینار کا آخری جلسہ ۲۹ اگست کو دن کے تین بجے جناب حیات اللہ انصاری کی صدارت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مقالے "بیدی کے اسلوب کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں" سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر نارنگ نے استعاراتی اور علامتی طرز اظہار کی معنویت سے بحث کرتے ہوئے بیدی کے چند افسانوں کا ان کے استعاروں اور دیومالائی علامتوں کی روشنی میں تجزیہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ محض تشبیہ سے زبان کو آراستہ کرنا ایک مصنوعی عمل ہے جو معنی کی لے کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس استعاراتی اور علامتی اظہار زبان کو معانی کی نئی فضاؤں سے روشناس کراتا ہے۔

دوسرا مقالہ جناب سریندر پرکاش نے "نیا افسانہ میری نظر میں" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے مختلف ادوار میں "تنے" کے بدلتے ہوئے تصور کا تجزیہ کیا اور زبان کے تخلیقی استعمال نیز اس میں دیومالائی اور تہذیبی علائم کی وساطت سے نئے تجربوں کے اظہار اور نئی حقیقتوں کے انکشاف سے بحث کی۔ اسی ضمن میں انھوں نے فن کار کے سماجی رشتوں کے ساتھ اس کی ذہنی آزادی کے مسئلے کا جائزہ بھی لیا۔

جلسے کا تیسرا مقالہ "افسانے میں شعور کی رو" ڈاکٹر محمد یٰسین صدیقی نے پڑھا جس میں تحلیل نفسی اور شعور کی رو کے مضمرات اور مغربی فکشن کے علاوہ اردو افسانہ نگاروں کے یہاں شعور کی رو کی تکنیک کے استعمال کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔

اس کے بعد جناب قاضی عبدالستار نے اپنا مقالہ "فکشن کی نثر، تخلیقی نثر" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے ترسیلی، علمی اور تخلیقی نثر کے حدود کی نشاندہی کرتے ہوئے افسانے میں موضوعات سے زبان کے رشتے اور اس کے تخلیقی آہنگ کی وضاحت کی۔

جلسے کا آخری مقالہ جناب چودھری محمد نعیم نے "سچا اور جھوٹا فکشن" کے عنوان سے پڑھا۔ اس مقالے میں حیات اللہ انصاری کے ناول لہو کے پھول، اور احمد ہمیش کی کہانی مکھی کے پس منظر میں سچے اور جھوٹے فکشن کی ہیئت اور اس کے تعمیری عناصر سے بحث کی گئی تھی۔ انھوں نے غیر فطری طوالت اور بے جا تفصیل کے مقابلے میں لفظ کے تخلیقی استعمال کو سچے فن کی اساس قرار دیا۔

وقت کی کمی کے باعث ڈاکٹر وید بھاگر یا چوپڑے کا مقالہ "ہندی اور مراٹھی فکشن" پر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا مقالہ احمد ندیم قاسمی کے فن پر، ڈاکٹر شمیم حنفی کا مقالہ "علامتی اظہار کے چند پہلوؤں پر" اور امیر زہرا کا مقالہ "۱۹۴۷ء کے بعد کی اردو افسانہ نگاری" پر نہ پڑھے جا سکے۔ کتابی صورت میں دوسرے مقالوں کے ساتھ یہ بھی شائع کئے جائیں گے۔

صدر شعبہ پروفیسر آل احمد سرور نے اس سہ روزہ سیمینار کے اختتام پر اپنی تقریر میں شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور سیمینار کے مقالات و مباحث کے مجموعی تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ علمی اور ادبی جلسوں میں گرمی سے زیادہ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس سیمینار میں ہر میلان کی بھرپور نمائندگی ہوئی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود بحث میں سنجیدگی اور علمی طریق کار کو پیش نظر رکھا گیا۔ افسانہ نگاروں کی شمولیت نے سیمینار کو اس لحاظ سے بھی اہم بنا دیا تھا کہ یہاں تخلیق و تنقید کے مزاج کو ساتھ ساتھ سمجھنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس سیمینار کا مقصد اردو کی ایک اہم صنف ادب کی رفتار و معیار کا جائزہ لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی ادبی اجتماع سے ادبی کارناموں کی حیثیت میں کمی یا اضافہ نہیں ہو جاتا، البتہ ان سے متعلق مسئلوں کو نئے زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی صورتیں یقیناً پیدا ہوتی ہیں اور اسی طرح تنقیدی ذہن فروغ پاتا ہے۔

سرور صاحب کی تقریر کے ساتھ سیمینار کا آخری جلسہ ختم ہوا۔ روزانہ تقریباً نو گھنٹوں کی طویل نشستوں کے باوجود دلچسپی آخر تک قائم رہی۔ ۲۹ اگست کی رات کو دوسری بار "شب افسانہ" منعقد کی گئی جس میں حیات اللہ انصاری، انور عظیم، اقبال مجید، اور دیویندر اسر نے اپنے اپنے افسانے سنائے۔

تمام شرکاء سیمینار کا بہت اچھا تاثر لے کر گئے۔ اب سارے مقالے اور بحث کا خلاصہ کتابی صورت میں جلد شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

• نامہ نگار "ہماری زبان"

صفحہ ۱۲ سے آگے

تو وہ اخلاقی قدریں جو المیہ اور طربیہ کارناموں کے درمیان مشترک ہیں اور جو یقیناً عیسائیت کی دین ہیں۔ دوسرے زندگی کے بارے میں وہ دعاوی (AFFIR MATIONS) یا مقبول اور تسلیم شدہ حقائق جو عیسوی نظام اقدار میں پیوست ہیں اور تیسرے وہ سوالات جو المیہ کارناموں کی کائنات میں ارتقاء پذیر تجربے سے ابھرے ہیں اور متذکرہ بالا دعاوی سے منسلک ہونے کی وجہ سے وہ بھی عیسائیت ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہاں سارے ذہنی مغالطوں کی کلید یا یہ کہئے کہ شیکسپیئر کے نامذہبی، غیر پابند اور اس کے آفاقی کردار کو ثابت کرنے کے پیچھے جو مفروضہ ہے وہ یہ کہ آخرالذکر عنصر پہلے دو عناصر سے یکسر غیر منقطع اور غیر منسلک ہے درآں حالیکہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ شیکسپیئر کے جو المیہ کارنامے ہملیٹ اور میکبتھ مذہبی المیہ کارنامے ہیں۔ اوّل الذکر مذہبی (IMPERATIVES) اور ضمیر کی جاں گسل آگ سے متعلق ہے اور موخرالذکر کے قلب میں راندۂ درگاہ ہونے (DAMNATION) کا تصور پایا جاتا ہے۔ میکبتھ کا اخلاقی ڈھانچہ ہملیٹ کے ابہام کے مقابلے میں بہت سادہ ہے اور اس میں ایک طرح کے مجازیے (ALLEGORY) کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ کنگ لیئر وجود اور اشیا کی بتدریج زوال کے تصور پر تعمیر کیا گیا ہے اور اس میں تشکیک کا عنصر بہت گہرا ہے لیکن اس کے باوجود آخر آخر میں جو وجدان ابھرتا ہے وہ مذہبی وجدان سے بہت قریب ہے اور اس میں رنج و عذاب کی بھائی چارگی (FELLOWSHIP OF SUFFERING) ایک اہم عنصر ہے۔ آخری دور کے ڈراموں میں بھی کم و بیش یہی عناصر پائے جاتے ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں جو استعجابیہ لے ہے وہ بالآخر ایک ایسے ایجاب اور یقین پر منتج ہوتی ہے جو اپنی روح اور جوہر کے اعتبار سے مذہبی ہے چاہے اس کی ظاہری شکل اس سے مختلف ہو۔

اس تمام بحث کے دوران میں نے دو باتیں کسی منزل پر نہیں کہیں۔ نہ تو یہ کہا گیا کہ بڑی شاعری صرف وہی ہے جس نے مذہبی تجربے اور مذہبی (IMPEARTIVES) سے قوت نمو حاصل کی ہو اور نہ یہ کہا گیا کہ نامذہبی موضوعات سے سروکار اچھی شاعری کو جنم نہیں دے سکتا۔ دعویٰ صرف یہ کیا گیا ہے کہ تخلیق کی اور شرائط اگر موجود ہوں تو مذہبی اقدار سے وابستگی یا مذہبی شعور و ادراک کے وسیلے سے شعری مواد کا انضباط بڑی شاعری کے معرض وجود میں آنے کی راہ میں ہرگز کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ ایسی شاعری بعض اعتبار سے نامذہبی شاعری کی نسبت اعلیٰ تر درجے کی چیز ہو۔ اس سے پہلے اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اقبال کے یہاں بعض جگہ طنز اور شوخی کا عنصر موجود ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں وہ بحیثیت شاعر اپنے مذہبی یا فلسفیانہ موقف سے عارضی اور لمحاتی طور پر اپنے آپ کو ایک حد تک الگ کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اپنے لئے تھوڑی سی آزادی روا رکھتے ہیں۔ مگر اس سے ان کے بنیادی مسلک اور شریعت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جن چند مغربی شاعروں کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے ان میں سے ملٹن، بلیک اور شیکسپیئر کے یہاں تو عیسائیت کی طرف بنیادی رجحان کے باوجود بعض انحرافات بھی ملتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ شاید وہ اشیاء کو خالص انفرادی اور ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں لیکن دانتے، لینگ لینڈ اور ایلیٹ کے یہاں صورت حال مختلف ہے۔ حالانکہ موخرالذکر تینوں شاعروں کی عظمت بھی اوّل الذکر کی طرح مسلم ہے۔ اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ اچھی اور بڑی شاعری لامرکزیت (ECCENTRICITY) یا غیر مشروط اور غیر پابند (NON-COMMITTED) نظریے کی لازمی طور پر تابع ہے۔ اگر اچھی گوارا اور دلکش شاعری محسوسات ہی کی طرح مجرد تصورات کی پروردہ بھی ہو سکتی ہے تو بڑی شاعری لامرکزی، تشکک اور نامذہبی رویوں کی طرح مثبت، غیر متزلزل اور مذہبی عقائد کے بطن سے بھی جنم لے سکتی ہے۔

فراق گورکھپوری نے جو بزعم خود اپنے آپ کو اقبال کا مدمقابل سمجھتے ہیں، محمد طفیل کے نام اپنے خطوط میں حسن عسکری کے حوالے سے اسلامی ادب کی اصطلاح پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور اقبال کی شاعرانہ عظمت پر بھی خاک ڈالنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔ ان کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اقبال کی شاعری اپنی اپیل میں محدود رہ جاتی ہے کہ اس کا ذہنی پس منظر اسلامی فلسفۂ حیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی فکر ہے۔ مجھے اسلامی ادب کی اصطلاح سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ادب کی اپنی ایک الگ اور منفرد کائنات ہوتی ہے اور اسے کسی مذہب کے ساتھ مختص کرنا ضروری نہیں ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ایسی شاعری جس میں بالصراحت بہ آواز بلند اور بین طور پر للکار کر یا خطابت کے انداز میں کوئی مسلک پیش کیا جائے، فنی اعتبار سے بہت زیادہ قابل اعتنا نہیں ہے۔ واقعات، نظریات اور عقائد کو چاہے ان کی بنیاد تاریخی ہو فلسفیانہ ہو یا مذہبی، نظم کر دینا ایک بات ہے اور تاریخی، فلسفیانہ اور مذہبی شعور و ادراک کا کسی ادبی کارنامے میں انعکاس قطعی مختلف امر ہے۔ خارجی کائنات کے مظاہر، تاریخی قوتوں کے ارتقاء اور خود تکوین کائنات کے بارے میں اور انسانی برتاؤ کی مختلف کیفیتوں کے بارے میں ہمارا رویہ لازمی طور پر ہمارے مرکزی نقطۂ نظر سے متاثر بھی ہوگا بلکہ وہی اسے متعین بھی کرے گا۔ مروجہ اور روایتی انداز کی غزل کے منتشر اور متفرق اشعار میں کسی اچھے خیال کے کوندے کے لپک جانے پر اپنی غزلوں کو آفاقی فکر کا جزو کہنا اور

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

قارئینِ "ہماری زبان" کو شاید یاد ہو کہ ۲۲ اکتوبر ۷۵ء کی اشاعت میں "میرا صفحہ" کے تحت میں نے اس بحث کا آغاز کیا تھا کہ کیا شاعری کی آفاقیت کی راہ میں مذہبی ادراک اور شعور کوئی ایک تحدیدی (LIMITING) عنصر ہے؟ بہ الفاظ دیگر کیا اچھی اور بڑی شاعری لامذہبی (SECULAR) موضوعات ہی کی بنیاد پر وجود میں آسکتی ہے؟ بعد کی اشاعتوں میں وقتاً فوقتاً اور یکے بعد دیگرے مغربی ادب کے صفِ اوّل کے کچھ شاعروں یعنی دانتے، لنگ لینڈ، ملٹن، بلیک، ایلیٹ اور شیکسپیئر کے کارناموں کے نہایت مختصر سے جائزے سے یہ بات نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی کہ ان سب شاعروں کے شعوری ادراک اور نقطۂ نظر میں عیسائیت ایک جزوِ لاینفک کی حیثیت سے شامل ہے اور اس کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت سے کسی طرح بھی انکار ممکن نہیں۔ پھر وہ کون سی منطق ہے جس کے پیشِ نظر اقبال کی عظمت صرف اس لیے مشتبہ ٹھیرے کہ ان کا تخلیقی شعور اسلامی تعلیمات، اسلامی روایات اور اسلامی اقدارِ حیات و کائنات سے محرک اور مرتعش ہوتا ہے۔ اس بحث کے تتمہ کے طور پر آج کی صحبت میں اس کے بعض اور پہلوؤں پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گو اقبال قدیم و جدید، مشرق اور مغرب کے بہت سے اہلِ دانش اور مکاتیبِ فکر سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن ان کے ذہن کی ساخت اور فکر کے ارتقا میں دو عناصر قوی ترین عناصر کہے جاسکتے ہیں، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ان کا عشق اور ایک متحرک، روح پرور اور انقلاب آفریں ضابطۂ حیات کی حیثیت سے اسلام میں ان کا ایمانِ محکم۔ اقبال کے مسلک کی رواداری کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ انھوں نے دوسرے مذاہب کے سربراہوں پر جتنی ستھری اور تعداد میں جتنی زیادہ نظمیں لکھی ہیں وہ کسی اور زبان کے شاعر نے شاید ہی لکھی ہوں۔ اپنے کچھ مشہور خطبات میں جو اسلام میں مذہبی فکر کی باز آفرینی سے متعلق ہیں، انھوں نے اسلامی تعلیمات کے مثبت، حرکی اور حریت انگیز پہلوؤں کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کہیں اعتذار کا لہجہ اختیار نہیں کیا اور نہ اسلام کو محض عقائد اور کرامات کی گٹھڑی سے تعبیر کیا۔ اقبال کی تنقید کے سلسلے میں یہ بات البتہ بہت دلچسپ ہے کہ ان کے نکتہ چین ان کے کلام میں ہر اس عنصر کو جو ان کے اپنے معتقدات سے میل کھاتا ہو، بہ رغبت قبول کرلیتے اور اسے ترقی پسندانہ قرار دینے میں مطلق تامل نہیں کرتے اور جہاں اقبال کو اس سے منحرف پاتے ہیں، انھیں رجعت پسند، فاشسٹ اور تنگ نظر اور کوتاہ بیں پکارنے لگتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں کوئی بین تضاد نہیں ہے۔ انھوں نے جہاں سے جو کچھ اخذ کیا ہے، اسلام کی بنیادی تعلیمات کی روشنی میں پرکھ کر اسے قبول یا مسترد کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات البتہ غور طلب ہے۔ مغربی ادب کی تاریخ میں وہ تناؤ (TENSION) برابر جھلکتا رہا ہے، جو خود عیسائیت میں موجود ہے یعنی دنیا کو اپنانے اور اسے مسترد کردینے کی دو طرفہ رجحانات کی بیک وقت موجودگی۔ کئی بڑے مغربی شاعروں کے یہاں ان کی بنیادی عیسائیت کے باوجود ایک طرح کی شمولیت (INCLUSIVENESS) اس معنی میں ملتی ہے کہ وہ عیسائیت اور پیگنزم (PAGANISM) یا عیسائیت اور لامذہبیت یا عیسائیت اور تشکیک کو بیک وقت روا رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی شخصیت کے سلسلے میں بھی ہمیں کافی تنوع اور رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ لینگ لینڈ نے انھیں ایک نائٹ (KNIGHT) فاتح (CONQUEROR) اور بادشاہ (KING) کی حیثیت سے پیش کیا ہے، بلیک نے ان کی قانون شکنی کی صفت کو ابھارنے میں اپنے نجی رجحانات اور انفرادیت پسندی کو ضرورت سے زیادہ دخل دیا ہے اور ڈن (DONNE) نے اپنی مذہبی نظموں میں ان کے نجات دہندہ (SAVIOUR) ہونے کے تصور کو نمایاں کیا ہے۔ اسلام کا معاملہ ذرا مختلف ہے کیونکہ اسلام شرک کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں خیر و شر کی تقسیم اور تمیز بہت واضح ہے اور انحراف کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ جہاں تک رسول کریم کی شخصیت کا تعلق ہے، یہ تصویر پہلے ہی اتنی مکمل، روشن اور جامع ہے کہ اس میں کسی ابہام کی گنجائش ہی نہیں اور نہ یہاں تعبیر و تفسیر کے معاملے میں کسی اختلاف کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔ البتہ خدا سے اقبال نے جو شوخیاں کی ہیں وہ کوئی چھپی ڈھکی چیز نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب شاعری میں مذہب کے دخل کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہاں عقائد کی تفصیلات اتنی اہم چیز نہیں ہیں جتنا کہ شاعر کا وہ وجدان کل جس پر مذہب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں اگر ہم شیکسپیئر کی مثال سامنے رکھیں تو بات کسی قدر واضح ہوجائے گی۔ اگر ہم صرف اس کے المیہ کارناموں ہی تک اپنے آپ کو محدود رکھیں تو اس سلسلے میں تین عناصر بہت اہم ہیں۔ اوّل

(باقی آئندہ)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ایڈیٹر و پبلشر سید تصدق حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ سے شائع کیا
REGD-NO. L-922 فون نمبر ۲۹ R.NO. 2156/57